

نذر سجاد حیدر کے ناول ”مذہب اور عشق“ میں تائینیت

Feminism in Nazar Sajjad Haider's Novel "Mazhab aur Ishq"

نمرہ تنویر

ایم فل سکالر، شعبہ اُردو، گورنمنٹ کالج ویمن یونیورسٹی، فیصل آباد

بازغہ قندیل

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، گورنمنٹ کالج ویمن یونیورسٹی، فیصل آباد

Nimra Tanvir

M.Phil Scholar, Department of Urdu, Govt. College Women University, Faisalabad.

Bazghah Qandeel

Assistant Professor, Department of Urdu, Govt. College Women University, Faisalabad.

ISSN

eISSN: 2789-6331

pISSN: 2789-4169



Copyright: © 2026 by the authors. This is an open access article distributed under the terms and conditions of the Creative Attribution Commons (CC BY) license

Abstract: Nazar Sajjad Haider's novel, "Mazhab aur Ishq", is a significant academic and research document of feminist consciousness and awakening in early twentieth-century Urdu literature. Challenging the traditional male-dominated society of that era, the author does not present women merely as oppressed and helpless beings, but rather elevates them as autonomous entities with their own decisions and emotions. The novel's highly educated heroine, Susheela, questions traditional social bonds and religious interpretations. Upon learning about women's true rights in Islam such as the right to choose marriage and achieve equal status through dialogues with a young Muslim man named Shabbir, she completely rejects traditional family pressure and chooses a life of her own volition. The feminist fabric of the novel clarifies the social distinction between gender and sex. The author demonstrates how society suppresses women under false assumptions of being "sensitive and weak-minded." This is evident in the subplot of Nirmala, whose father sells her to an old man without her consent. Through her characters, Haider criticizes the prevailing strict veil as an obstacle to women's development, emphasizing that a woman's discretion and free will must be included in crucial decisions like marriage; otherwise, human lives become torment. Ultimately, instead of reducing "love" to a superficial romantic trope, this novel uses it as a vehicle for women's intellectual freedom and autonomy. Concurrently, it presents "religion" in its true, progressive form, using it as a shield against social oppression. Although Susheela's seemingly enlightened parents cast her out for her interfaith marriage, she remains content with her choice. This narrative proves that the struggle for women's liberation is about establishing a dignified balance between social values and personal rights, where women are

	independent creators of their own destiny. Keywords: Nazar Sajjad Haider, Mazhab aur Ishq, Feminist, Urdu Literature, Sensitive, Weak-Minded, Destiny
--	---

بیسویں صدی کے اوائل میں جب اصلاحی ناول لکھے جا رہے تھے۔ ان عورتوں میں رشیدۃ النساء، صغر اہالیوں، محمدی بیگم اور نذر سجاد حیدر کے نام قابل ذکر ہیں۔ خواتین میں بیداری و اصلاح کی لہر بیدار کرنے میں نذر سجاد حیدر کا نام سرفہرست ہے۔

نذر سجاد حیدر اردو افسانوی ادب میں ایک معتبر اور اہم اصلاحی ناول نگار کی حیثیت سے منفرد مقام رکھتی ہیں۔ انہوں نے اپنے ناولوں کے کینوس پر بیسویں صدی کے اوائل کے ہندوستانی معاشرے کی حقیقی اور جاندار منظر کشی کی ہے، اور ان سماجی تصاویر میں تخلیقی رنگ اس مہارت سے بھرے ہیں کہ اس دور کے تمام تر معاشرتی احوال اپنی پوری سچائی کے ساتھ قاری کے ذہن پر نقش ہو جاتے ہیں۔ چونکہ نذر سجاد حیدر بذات خود سماجی فلاح اور نسوانہ اصلاح کے کاموں میں ایک سرگرم رکن کے طور پر وابستہ تھیں، اس لیے ان کا یہ مصلحانہ جذبہ اور فکری پختگی ان کی تحریروں میں بالکل واضح اور نمایاں دکھائی دیتی ہے۔ انہوں نے اپنے ناولوں میں محض روایتی قصہ گوئی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اس دور کے مسلم معاشرے میں موجود پسماندہ رسوم و رواج اور خامیوں سے پردہ اٹھایا ہے؛ اور ان مسائل کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ تمدنی ارتقا کے لیے ان کے مناسب تدارک اور ممکنہ حل بھی تجویز کیے ہیں۔ ان کی قابل ذکر تصانیف اور ادبی تخلیقات میں ”اختر النساء بیگم“، ”جان باز“، ”حرماں نصیب“، ”آہِ مظلوماں“، ”نجمہ“ اور ”ثریا“ جیسے اہم ناول شامل ہیں۔

تائینت کی تفہیم کے لیے لفظ ”عورت“ کا ادراک حاصل کرنا ناگزیر ہے۔ چونکہ تائینت کا موضوع عورت ہے اس لیے اولاً یہ سمجھنا ضروری ہے عورت کیا ہے؟ زمین پر انسان کے دو طبقے ہیں مرد اور عورت۔ مرد اور عورت میں کئی سطحوں پر فرق ہے جس کا برقرار رہنا معاشرے کے ارتقا کے لیے اشد ضروری ہے۔

مرد اور عورت میں یہ فرق اختلاف جنس (Sex) اور صنف (Gender) کا ہے۔ جنس کا فرق فطری ہے جب کہ کسی گروہ کے اختیارات بڑھانے اور کسی کے کم کرنے کے لیے صنف کا فرق طے شدہ ہے۔ مثلاً شجاعت، جنگ جوئی، مہم جوئی، تفکر پسندی، قائدانہ کردار جیسی خصوصیات سے مردانہ طبقے کو نواز دیتے ہیں جب کہ نسبتاً کمزور، کم



عقلی، نازک دلی، رقیق القلبی، شرم و حیاء اور ضد و غیرہ عورتوں سے منسوب کر کے انہیں اہم صلاحیتوں سے سبک دوش کر دیتے ہیں۔

عورت کو تاریخ کا قدیم، متنازع، ناقابل فہم الجھا ہوا موضوع کہا گیا جس کی وجہ تاریخ کے ہر عہد میں یہ رہی کہ عورت کو ہمیشہ تصورات کی عینک سے دیکھا گیا۔ ڈاکٹر عقیلہ جاوید لکھتی ہیں:

”عورت کے وجودی تشخص کی حقیقت کیا ہے؟ اس کا جواب شاعروں کے دووین، علما کی فصاحت و بلاغت، اہل زبان کی لسانی مہارت اور اہل نظر کے جمالیاتی تصورات میں بکھرا ہوا ہے۔ دیکھا جائے تو عورت کا ناتی تاریخ کا قدیم ترین اختلافی اور فلسفیانہ موضوع ہے۔ سامی روایات میں بائبل کی ’حوا‘ اور یونانی مائیتھالوجی کی ’پنڈورا‘ کے اساطیری تصورات سے لے کر دورِ حاضر تک، متعدد تہذیبیں، مذاہب اور اقوام معرض وجود میں آئیں اور اپنے منطقی انجام کو پہنچیں، لیکن ہر عہد کے مصلحین، مفکرین، مبلغین اور ناقدین نے صنفِ نازک کے وجود اور اس کے سماجی کردار پر خامہ فرسائی کی ہے۔ اس کے باوجود عورت ایک ایسا معمہ اور ناقابل فہم حقیقت ہے، جسے ہر دور میں معروضی حقائق کے بجائے زیادہ تر تخیل اور تصورات کے آئینے ہی میں دیکھا جاتا رہا ہے۔“^(۱)

”مذہب اور عشق“ بین المذاہب (ہندو مسلم) شادی کے حساس موضوع پر تخلیق کیا گیا مصنفہ کا ایک ایسا شاہکار ناول ہے جس میں انہوں نے روایتی سماجی نظام کی تلخ حقیقتوں کو بے نقاب کیا ہے۔ اس بیانیے میں مصنفہ نے خاص طور پر صنفِ نازک کے حقوق اور اسلامی تناظر میں تصورِ حجاب (پردے) کی حقیقی روح اور معنویت پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔

نذر سجاد حیدر کے یہ ناول اگرچہ تقسیم ہند سے قبل کے اعلیٰ متوسط اور روشن خیال طبقے کی طرزِ معاشرت، فکری رجحانات اور تمدنی اقدار کے آئینہ دار ہیں، تاہم ان کے کیونوس پر عام اور پسماندہ طبقے کی عورت کے دلی جذبات اور احساسات کی ترجمانی بھی پوری شدت کے ساتھ ابھرتی ہے۔ وہ عورت جو ہر دور اور ہر موڑ پر خود کو فرسودہ سماجی بندھنوں اور مذہبی ملوکیت کی زنجیروں میں جکڑا ہوا پاتی ہے۔ چنانچہ صنفِ انات کی تعلیم و تربیت کا معاملہ ہو، ان کی

مرضی کے مطابق شادی بیاہ کا فیصلہ ہو یا زندگی کے دیگر تمدنی معاملات — مروجہ روایتی سماج اور مذہب کی ظاہری تعبیرات ہر جگہ اس کی شخصی آزادی اور ترقی کی راہ میں سدِ راہ بن کر کھڑی دکھائی دیتی ہیں۔

نذر سجاد حیدر کے ناول ”مذہب اور عشق“ کے تانے بانے اور داستاں کا آغاز ایک متمول اور اشرافیہ گھرانے کے احوال سے ہوتا ہے۔ کہانی کے مرکزی کرداروں میں مسٹر سریش چندر مکھرجی ایک نامور، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور جدید خیالات کے حامل بیرسٹر ہیں؛ ان کا بیٹا ہریش چندر بھی اسی پیشے (وکالت) سے وابستہ ہے، جب کہ ان کی دونوں بیٹیاں بھی اعلیٰ تعلیم کے مراحل طے کر رہی ہیں۔ مکھرجی صاحب نے اپنی بڑی بیٹی سوشیلا کو محض پانچ برس کی کم عمری ہی میں جدید تعلیم و تربیت کے حصول کے لیے انگلستان (لندن) بھجوا دیا تھا، جو تیرہ طویل برس وہاں گزارنے کے بعد بالآخر بمبئی (موجودہ ممبئی) واپس لوٹتی ہے۔ مغرب سے پلٹنے والی اس تعلیم یافتہ دوشیزہ کے شاندار استقبال کے لیے بیرسٹر مکھرجی کے دیرینہ اور مخلص دوست، سر لقمان، ان کی اہلیہ اور صاحبزادی رتن بائی کے ہمراہ ’اپولو بندر گاہ (Apollo Bunder) پر پہنچتے ہیں، اور یہ تمام احباب مسرت و شادمانی کے جذبات کے ساتھ سوشیلا کو ہمراہ لے کر الوداعی منزل کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔

سوشیلا کے قیام لندن کے تیرہ سالہ تعلیمی دورانیے میں ان کے والدین کم و بیش سات سے آٹھ مرتبہ اپنی بیٹی سے ملاقات کے لیے خود انگلستان کا سفر اختیار کر چکے تھے، جب کہ سر مکھرجی کا بیٹا ہریش چندر بھی تقریباً نو برس وہاں مقیم رہا تھا۔ اگرچہ اس مغربی طرز زندگی اور مہنگے تعلیمی نظام کے باعث سوشیلا نے اعلیٰ درجے کی تعلیم اور جدید آداب تو سیکھ لیے، مگر اس حد سے بڑھے ہوئے یورپی اثر کا ایک منفی پہلو یہ نکلا کہ وہ اپنے مروجہ خاندانی مذہب اور ہندوستانی زبانوں و ثقافت سے بالکل ناواقف ہو کر رہ گئی۔ بعد ازاں، سر مکھرجی کے قریبی دوست مسٹر لقمان کے نجی معتمد (پرائیویٹ سیکرٹری) مسٹر شبیر منظر عام پر آتے ہیں، جو کہ ایک انتہائی باصلاحیت قانون داں اور بیرسٹر ہیں اور بعض ناگزیر ذاتی مجبوریاں کے باعث ’چندر نگر‘ میں مقیم ہیں۔ کہانی میں فکری اور تمدنی تبدیلی کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب سوشیلا بائی اپنی مادری اور قومی زبان سیکھنے کی غرض سے مسٹر شبیر سے باقاعدہ اردو زبان کی تدریس کا سلسلہ شروع کرتی ہے۔

ناول کے پلاٹ میں ایک اہم موڑ اس وقت آتا ہے جب مس کیتھرین میونامی ایک امریکی خاتون اور سیاح، ہندوستان کے سماجی احوال اور معاشرتی کیفیات کا جائزہ لینے کے لیے یہاں وارد ہوتی ہیں۔ بمبئی میں قیام کے دوران سر

لقمان نے ان کے سامنے مسٹر شبیر کی غیر معمولی علمی قابلیت اور وسعتِ مطالعہ کا تذکرہ کیا۔ چنانچہ، مس میونے ہندوستان کی سیاحت کے دوران یہاں کی معاشرت، طرزِ زندگی اور رسوم و رواج کے متعلق جو یادداشتیں اور مسودات مرتب کیے تھے، وہ سب شبیر صاحب کو تنقیدی مطالعے اور تصحیح کے لیے سونپ دیے۔ مسٹر شبیر ان مسودات کا گہرا علمی جائزہ لیتے ہیں اور سوشیلا کی فکری دلچسپی کو دیکھتے ہوئے اسے بھی ان تمام مشاہدات و قصص سے آگاہ کرتے ہیں جو اس امریکی خاتون نے قلم بند کیے تھے۔ اس کے ساتھ ہی، وہ تقابلی مطالعے کے طور پر سوشیلا کے سامنے عہدِ رسالت اور قدیم عرب تمدن میں صنفِ نازک کی شخصی آزادی، علمی استعداد اور حربی صلاحیتوں کے جوہر بھی آشکار کرتے ہیں کہ کس طرح عرب معاشرے میں بعض خواتین شہسواری، تیر اندازی، نیزہ بازی اور شمشیر زنی جیسے شاق امور میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھیں، اور تاریخ میں جن کی نظیریں آج بھی مفقود ہیں۔

اس ناول کا مرکزی نسوانی کردار سوشیلا ہے، جو ایک انتہائی متمول اور آزاد خیال ماحول کی پروردہ ہے۔ مغرب سے اعلیٰ تعلیم کی تکمیل کے بعد جب وہ وطن لوٹتی ہے، تو اس کا فکری تعامل مسلم نوجوان بیرو سٹر شبیر سے ہوتا ہے۔ دونوں کے مابین اسلامی شریعت میں عورت کے اصل مقام، حقوق اور تمدنی مرتبے کو لے کر طویل بحث و مباحثے کا سلسلہ چل نکلتا ہے۔ شبیر کمالِ تدبر کے ساتھ مسلم معاشرے کی پسماندگی اور اسلام کی اصل روح کے مابین فرق واضح کرتے ہوئے سوشیلا کے ذہن میں مروجہ اسلامی احکامات کے بارے میں قائم تمام تر غلط فہمیوں کا ازالہ کرتا ہے۔ وہ سوشیلا کی طرف سے اٹھائے گئے تمام کلامی اور معاشرتی سوالات کے جوابات قرآن و حدیث اور عقلی دلائل کی روشنی میں فراہم کرتا ہے، جس سے متاثر ہو کر وہ نہ صرف اسلام قبول کرنے کا اصولی فیصلہ کرتی ہے بلکہ شبیر کی فکری اساس اور رفاقت کی محبت میں بھی گرفتار ہو جاتی ہے۔ بظاہر یہ بیانیہ ایک روایتی رومانوی کہانی کا تاثر دیتا ہے، مگر نذر سجاد حیدر نے کمالِ فن سے کام لیتے ہوئے سوشیلا کے انہی استفہامات اور سوالات کے ذریعے مسلم خواتین کو پیش آنے والے حقیقی سماجی مسائل، ان کی تذلیل اور حقوق کی پامالی پر گہری تنقید کی ہے۔ چنانچہ، ایک موقع پر اپنی فکری الجھن کا اظہار کرتے ہوئے سوشیلا، شبیر سے مخاطب ہو کر کہتی ہے:

”دنیا کے کسی بھی مروجہ تمدنی یا روایتی مذہب نے صنفِ نازک کے حقوق کے ساتھ حقیقی انصاف روا نہیں رکھا، بلکہ کم و بیش ہر مذہبی نظام عورت کو مرد کی محکوم اور محض ایک کنیز بے بس قرار دیتا آیا ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ سماج کے



جن طبقات میں ظاہری مذہبیت کا غلبہ اور شدت جتنی زیادہ پائی جاتی ہے، وہاں عورت کا وجود تمدنی اور معاشرتی اعتبار سے اسی قدر ذلت، تذلیل اور پسماندگی کا شکار نظر آتا ہے۔“ (۲)

سوشیلا کا یہ فکری رویہ اور تاثر دراصل اس کے معروضی مشاہدات کا نتیجہ ہے، کیونکہ وہ اپنے ارد گرد کے ماحول میں صنفِ نازک کے ساتھ برتا جانے والا غیر مساویانہ، متعصبانہ اور تحقیر آمیز سلوک ہی دیکھتی آئی ہے؛ اسی بنا پر وہ اس نتیجے پر پہنچتی ہے کہ ہر مذہب اصولی طور پر عورت کی مظلومیت کا ذمہ دار ہے۔ اس کے برعکس، شبیر کمال متانت اور فکری دانش سے کام لیتے ہوئے اس کی اس مروجہ غلط فہمی کا ازالہ کرتا ہے؛ وہ مدلل انداز میں یہ حقیقت واضح کرتا ہے کہ مسلم معاشرے کے انحطاط کو اسلام کے کھاتے میں نہیں ڈالا جاسکتا، کیونکہ اسلام ہی وہ واحد دین ہے جس نے عورت کو قانونی، معاشی اور تمدنی طور پر مرد کے مساوی حقوق اور ایک باوقار سماجی مرتبہ عطا کیا ہے۔

”رسول اکرم ﷺ کا فرمانِ عالی شان ہے کہ ’تم میں سے بہترین شخص وہ ہے جو اپنی اہلیہ کے حق میں سب سے بہتر اور خوش اخلاق ہو۔‘ علاوہ ازیں، ازدواجی و تمدنی حقوق کی باہمی برابری کے متعلق ارشادِ ربانی ہوا کہ ’اور عورتوں کے بھی معروف طریقے پر ویسے ہی حقوق ہیں، جیسے مردوں کے حقوق عورتوں پر ہیں۔‘ مزید برآں، شریعتِ اسلامیہ نے حصولِ علم کو جہاں مردوں کے لیے لازم کیا، وہیں اسے صنفِ اناث کے لیے بھی یکساں طور پر فریضہ قرار دے کر معاشرے میں عورت کی ذہنی بالیدگی، تعلیم اور سماجی ترقی کے مسدود دروازے ہمیشہ کے لیے کھول دیے۔“ (۳)

سوشیلا بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے صنفِ نازک کے ازدواجی حقوق کا مسئلہ اٹھاتی ہے اور اس تلخ معاشرتی حقیقت پر تنقید کرتی ہے کہ مروجہ سماجی نظام میں عورت کو اپنی مرضی اور پسند کے مطابق رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے؛ بلکہ اکثر اوقات دوشیزہ کی صریح مرضی اور خواہش کے برعکس محض خاندانی دباؤ کے تحت اس کی شادی کسی بھی جگہ کر دی جاتی ہے۔ شبیر اس نازک تمدنی معاملے میں بھی روایتی سماج کے فرسودہ رویوں اور اسلامی احکامات کے مابین تفریق واضح کرتا ہے۔ وہ اسلام کی حقیقی تعبیرات اور شرعی نصوص کی روشنی میں اسے ان حقائق سے آگاہ کرتا ہے کہ اسلام نے بالغ عورت کو اپنے نکاح اور جیون ساتھی کے انتخاب کا مکمل اور خود

مختار انہ حق عطا کیا ہے، اور لڑکی کی صریح اجازت یا اذنِ باطل کے بغیر زبردستی کیا جانے والا کوئی بھی عقد شرعاً باطل تصور ہوتا ہے۔

”شریعتِ اسلامیہ نے صنفِ نازک کو سن بلوغت تک پہنچنے کے بعد یہ کامل اور خود مختار انہ قانونی اختیار تفویض کر رکھا ہے کہ وہ اپنی آزاد مرضی، صوابدید اور پسند کے مطابق جس فرد کو چاہے اپنا شریکِ حیات اور رفیقِ زندگی منتخب کر سکتی ہے، اور اس انتخاب میں سماج یا خاندان کا کوئی بھی فرد اس پر اپنی مرضی زبردستی مسلط کرنے کا مجاز نہیں ہے۔“ (۴)

اسلام کے اصولوں کے مطابق اتنی باتیں سن کر سوشیلا بے حد متاثر ہوتی ہے۔

”مزید برآں، میں اب تک اس حقیقت سے بھی مکمل طور پر بے خبر تھی کہ اسلام نے صنفِ نازک کو معاشرتی و تمدنی طور پر مردوں کے لگ بھگ مساوی حقوق عطا کر رکھے ہیں، اور اپنے تشریحی و قانونی ڈھانچے میں اس صنفِ ضعیف کی مصلحتوں، تحفظ اور نفسیات کا خاص طور پر لحاظ رکھا ہے۔“ (۵)

سوشیلا چونکہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ، بیدار مغز اور روشن خیال دوشیزہ ہے، اس لیے وہ مروجہ سماجی روایات کو آنکھیں بند کر کے قبول کرنے کے بجائے ہر فکری اور تمدنی معاملے کو عقل، برہان اور حقائق کی کسوٹی پر پرکھنے کی عادی ہے۔ جب وہ مکمل فکری شرح صدر کے بعد اسلام قبول کرنے کے پختہ فیصلے کا اظہار کرتی ہے، تو اس کی بھابھی (بھاوج) چندرانی روایتی خاندانی ردِ عمل کے تحت اسے اس فیصلے کے سنگین نتائج کے بارے میں سخت ترین تنبیہ کرتی ہے۔ چندرانی کی اس جذباتی مصلحت پسندی اور مذہبی عصیت کے جواب میں سوشیلا کمالِ استقلال اور دلیل کے ساتھ مخاطب ہو کر کہتی ہے:

”دورِ حاضر کے اس فکری اور تمدنی ارتقا کے عہد میں کوئی بھی شخص کسی دوسرے پر اپنی مرضی مسلط کرنے یا جبر و سختی روا رکھنے کا شرعاً و قانوناً مجاز نہیں ہے۔ میں محض روایتی ہندوستانی تہذیب کے آداب، خاندانی لحاظ اور مروت کے باعث اب تک ان سب کٹھن حالات کو خاموشی سے برداشت کر رہی ہوں۔ لیکن اگر میں اس لحاظ کو بالائے طاق رکھ دوں، تو کسی بھی فرد کو مجھ پر بے جا ذہنی یا جسمانی

تشدد کرنے کا کوئی اخلاقی و قانونی حق حاصل نہیں ہے۔ کیا آپ لوگ اب بھی ماضی کی ان فرسودہ ہندووانہ روایات کو دوبارہ زندہ کرنا چاہتے ہیں جہاں عورت شخصی آزادی سے محروم تھی؟ یاد رکھیے، ایک جدید، بیدار مغز اور آزاد خیال لڑکی اس نوعیت کا ناروا جبر اور قدامت پسندی ہرگز برداشت نہیں کر سکتی۔^(۶)

یہ لیجیے، اس فکری تجزیے اور ناول کے آخری حصے کا ایک انتہائی جامع، فصیح اور اکیڈمک اسلوب میں ری رائٹ شدہ ورژن:

سوشیلا اپنے شخصی وجود اور تمدنی حقوق کے معاملے میں مکمل طور پر خود مختار ہے اور وہ اپنی زندگی کو روایتی سماج کے کھوکھلے اصولوں، فرسودہ رسوم اور نام نہاد خاندانی غیرت کی بھینٹ چڑھانے کے سخت خلاف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ شدید ترین خاندانی اور سماجی مخالفت کے باوجود، محض اپنے فکری نظریات کی بنیاد پر، اسلام قبول کرنے کے فیصلے پر ڈٹی رہتی ہے۔ عقد نکاح سے قبل شبیر کمال دیانت داری اور فکری پختگی کے ساتھ سوشیلا سے یہ استفسار کرتا ہے کہ کہیں اس کی قبول اسلام کی اصل وجہ شبیر کے لیے اس کی رومانوی محبت تو نہیں؟ اس نازک سوال پر سوشیلا انتہائی واضح اور دو ٹوک انداز میں جواب دیتی ہے کہ اس کے ذہن میں صنف نازک کے تمدنی استحصال اور حقوق کے حوالے سے جو کلامی اور معاشرتی سوالات طویل عرصے سے گردش کر رہے تھے، ان کے تسلی بخش اور مدلل جوابات اسے مروجہ مذاہب کے بجائے صرف شریعت اسلامیہ کے ضابطوں ہی میں نظر آئے۔ چنانچہ، اس کا یہ اعتراف اس امر کا بین ثبوت ہے کہ سوشیلا کا رجحان اسلام دراصل دین فطرت میں عورت کو حاصل مساویانہ، باوقار اور محفوظ ترین سماجی حیثیت کا مرہون منت ہے۔

اگرچہ نذر سجاد حیدر کوئی باضابطہ مذہبی مبلغ یا مفسر نہیں تھیں، لیکن جب انہوں نے تقابلی مطالعے کے بعد یہ محسوس کیا کہ دیگر معاصر مذاہب اور ہندوستانی تہذیب کی نسبت اسلام نے عورت کو کہیں زیادہ حقوق اور سماجی تحفظ فراہم کیا ہے، تو انہوں نے اس حقیقت کو کمال فن کے ساتھ اپنے ناول کے پلاٹ میں تفصیلی اور استدلالی طور پر جگہ دی۔ ان کی یہ ادبی کاوش دراصل صنف انات کی فکری اصلاح اور ان کی تمدنی بیداری کی ایک شعوری مصلحانہ کوشش تھی۔ نذر سجاد حیدر کی نسوانی حسیت عورت کے جس باوقار اور آزاد وجود کا خواب دیکھ رہی تھی، اس کی جھلک انہیں اسلام کی اصل روح میں دکھائی دی، اسی لیے انہوں نے اس کا برملا اور جرات مند انہ اظہار کیا۔ تاہم، نذر سجاد

حیدر مروجہ روایتی اور سخت گیر پردے (حجاب مروج) کے خلاف تھیں اور اسے عورت کی سماجی، تعلیمی اور شخصی ترقی کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ تصور کرتی تھیں۔ وہ اپنے ناول میں بھی اس مروجہ خاندانی قید کے خلاف احتجاج بلند کرتی نظر آتی ہیں۔ چنانچہ، جب کہانی میں سوشیلا پردے کی شرعی اور روایتی حیثیت کے بارے میں گل نار سے سوال کرتی ہے، تو گل نار اس کے جواب میں کہتی ہے:

”میری پیاری بہن! مروجہ اور فرسودہ رسم حجاب (سخت گیر پردے) میں اگر محض ایک دو خامیاں یا خرابیاں ہوتیں تو انہیں بیان بھی کیا جاتا، یہاں تو معاملہ یہ ہے کہ یہ مروجہ قید بذات خود سراسر برائی، بے بسی اور صنفِ نازک کی تمدنی پسماندگی کا سبب ہے۔“ (۷)

نذر سجاد حیدر کے نزدیک مروجہ اور سخت گیر رسم حجاب میں کوئی تمدنی یا اخلاقی افادیت پنہاں نہیں ہے، بلکہ وہ پردے کے اس روایتی تصور کو عورت کی شخصی آزادی پر ایک قدغن اور اس کے لیے ایک دائمی قید خانہ تصور کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے فکری اور باغیانہ کرداروں کے ذریعے مروجہ پردے کے اس روایتی ڈھانچے کو معائب کا مآخذ اور صنفِ نازک کی ترقی میں سدِ راہ گردانتی ہیں۔ غرض یہ کہ نذر سجاد حیدر کے یہ اصلاحی اور تجدیدی خیالات اس حقیقت کو پوری طرح آشکار کرتے ہیں کہ وہ سماج میں عورت کو روایتی ملوکیت اور فرسودہ سماجی بندھنوں سے آزاد، تعلیم یافتہ اور اپنے تمدنی حقوق سے بہرہ ور ایک باوقار فرد کے روپ میں دیکھنے کی خواہاں تھیں۔

ناول کے فکری ارتقا میں ایک اہم مرحلہ اس وقت آتا ہے جب سوشیلا ان علمی مباحث کے دوران خاص طور پر شبیر سے شریعتِ اسلامیہ کے حقیقی مآخذ اور تعلیمات سے پردہ اٹھانے کا اصرار کرتی ہے۔ وہ کمالِ اشتیاق کے ساتھ بانی اسلام، پیغمبر اکرم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی سیرتِ طیبہ اور سوانحِ حیات کے مخفی گوشوں کے بارے میں دریافت کرتی ہے۔ شبیر نہایت مؤثر، دلنشین اور علمی پیرائے میں آپ ﷺ کی اسوہ حسنہ، مکرم اخلاق اور دین اسلام کے تمدنی و اخلاقی محاسن کو سوشیلا کے سامنے واضح و آشکار کرتا ہے۔

سوشیلا جیسے ہی اسلام کی ان آفاقی اچھائیوں اور عدل پرور نظام سے روشناس ہوتی ہے، تو اس کے اندر حق کی جستجو اور مزید معرفت حاصل کرنے کا تجسس علمی اور زیادہ بیدار ہو جاتا ہے۔ اس موقع پر شبیر اس کی فکری توجہ کو دوبارہ مس کیتھیرن میو کے ان یادداشتوں اور مسودات کی طرف مبذول کراتا ہے، جو اس امر کی خاتون نے برصغیر



کے مروجہ مذاہب اور بالخصوص یہاں کی تمدنی زندگی میں عورتوں کی زبوں حالی اور مظلومیت پر مرتب کیے تھے۔ شبیر انہی تاریخی مسودات کا حوالہ دیتے ہوئے سوشیلا کو 'محمود ابدالی کا ایک عبرت ناک اور سبق آموز قصہ سناتا ہے۔ وہ اسے بتاتا ہے کہ محمود ابدالی ایک انتہائی صالح، درویش منش اور ولی صفت بزرگ تھے، جنہوں نے اپنی اقدار کے مطابق 'اسلام پور' نامی ایک قصبہ آباد کیا تھا۔ اس بستی کے باشندے صوفیانہ طرز حیات، گہری دینداری اور حلال کمائی کے اصولوں پر کار بند رہ کر قناعت پسندی کے ساتھ بسر اوقات کرتے تھے۔

مگر ایک طویل عرصے کے بعد، جب برطانوی استعمار (انگریزوں کے دور) میں اسلام پور کی معاشی اور مالی حالت انحطاط کا شکار ہو گئی، تو مروجہ سرمایہ دارانہ نظام کے حامل بننے اس علاقے کی طرف متوجہ ہوئے۔ یہ بننے چونکہ اپنی جبلت اور تجارتی جینیات میں حد درجہ کنجوس، بزدل، حریص اور عاقبت ناندیش واقع ہوئے تھے اور سود خوری کے کاروبار کو معاشی ترقی کا بہترین ذریعہ سمجھتے تھے، چنانچہ انہوں نے اپنی عیاری، چال بازی اور مالی ہتھکنڈوں کے ذریعے اس مسلم اکثریتی شہر میں بتدریج اپنی آبادی اور اثر و رسوخ میں اضافہ کرنا شروع کر دیا۔ اس تمدنی دراندازی کے ساتھ ہی انہوں نے معاشرے کو کھوکھلا کرنے والی لعنت، یعنی سود جیسے حرام اور استحصالی کاروبار کی بنیاد رکھ دی۔ ان سود خور نسلیوں میں ایک متمول ہندو تاجر 'بابورام' بھی شامل تھا۔ بابورام کی اہلیہ کا اگرچہ انتقال ہو چکا تھا، مگر اس کے خانگی حلقے میں اس کی ایک نوخیز بیٹی اور ایک بیوہ بہن موجود تھیں، جو اس خاندانی اور معاشرتی ماحول کی پروردہ تھیں۔ بابورام اپنی بیٹی نرملہ کو قدامت پسندی اور جہالت کی ایک تاریک اور جس زدہ خانگی فضا میں قید رکھتا ہے، جہاں اسے بیرونی دنیا کے حقائق، علم اور سماجی تغیرات سے بالکل بے خبر رکھا گیا ہے۔ نرملہ کی بوڑھی پھوپھی سروجنی، جو خود اسی فرسودہ تمدن کی پروردہ ہے، اسے بچپن ہی سے صرف بے جان مورتیوں کی پوجا رچنا کرنے اور انہیں خوش رکھنے کے روایتی طریقے سکھاتی ہے۔ مگر نرملہ کی فطری ذہانت، شعور اور آزاد جبلت اس محدود اور جابرانہ ماحول پر ہرگز اکتفا نہیں کرتی۔ وہ ان مورتیوں کے بارے میں کوئی اچھی یا عقیدت مندانہ رائے نہیں رکھتی تھی، بلکہ وہ تو ہم پرستی پر مبنی ان مظاہر کی پوجا کرنے سے صریح انکار کر دیتی ہے۔

جب بوڑھی پھوپھی سروجنی، نرملہ کے ان باغیانہ اور غیر روایتی خیالات سے واقف ہوتی ہے، تو وہ خاندانی عصبیت کے تحت اسے سخت ڈانٹ ڈپٹ کا نشانہ بناتی ہے اور اگلے ہی روز بابورام کو نرملہ کے ان بدلتے ہوئے فکری رویوں سے آگاہ کرتی ہے۔ وہ بابورام کو سخت ملامت کرتے ہوئے کہتی ہے کہ 'تم نے لڑکی کے لیے مناسب ور (دولہا)

تلاش کرنے میں بہت دیر کر دی ہے، اور اب دیوتا ان کے خاندانی انحراف پر ناراض ہو کر لڑکی کو تباہی و مگرابی کی طرف دھکیل رہے ہیں! بابورام بہن کی یہ باتیں سن کر گہری تشویش میں مبتلا ہو جاتا ہے اور بغیر کچھ کہے بازار کی طرف نکل جاتا ہے۔ راستے میں اسے برادری کے لوگوں کے طنزیہ جملوں اور تیکھی نظروں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جو اس کے لیے ایک معاشرتی دباؤ بن جاتے ہیں کہ اگر بابورام نے جلد از جلد اپنی جواں سال بیٹی کے ہاتھ پیلے نہ کیے اور اس کی شادی نہ رچائی، تو اسے برادری سے یکسر خارج (برادری باہر) کر دیا جائے گا۔

یہ تمام صورت حال اس دور کے ہندوستانی معاشرے میں عورت کی بے بسی اور اس پر مسلط سماجی بندھنوں کی عکاسی کرتی ہے۔ تانیشی نقطہ نظر اور نسوانی حسیت کے حوالے سے اس ناول کا یہ اہم اور جرات مندانہ اقتباس ملاحظہ

ہو:

”بابورام جب گھر لوٹتا ہے تو اپنی سماجی خفت کا غصہ نرملا پر نکالتا ہے اور اسے کوستے ہوئے یہاں تک کہہ جاتا ہے کہ وہ پیدا ہی کیوں ہوئی تھی۔ دراصل بابورام اپنی جبلی کنجوسی اور بخیل فطرت کے باعث لڑکی کے لیے بھاری جہیز یا مناسب رشتہ تلاش کرنے میں ناکام رہا تھا، اور اب برادری کے طعنوں سے بچنے کے لیے وہ شدید ذہنی اضطراب کا شکار رہنے لگتا ہے؛ تاہم، جلد ہی اسے اپنی اس پریشانی کا ایک غیر اخلاقی اور مادہ پرستانہ حل مل جاتا ہے۔ وہ اپنی نوخیز بیٹی نرملا کی شادی 'کشیپ دت' نامی ایک ایسے بوڑھے سے طے کرنے کا فیصلہ کرتا ہے جو خود دے اور گھٹیا جیسے موذی امراض کا مستقل مریض ہے اور جس کی عمر ساٹھ برس سے بھی تجاوز کر چکی ہے۔ بابورام ایک روایتی مصلح (نائی) کے ذریعے رشتہ ازدواج کی یہ پیشکش کشیپ دت تک پہنچاتا ہے۔ وہ عمر رسیدہ شخص نہ صرف اس لرزہ خیز رشتے پر فوراً راضی ہو جاتا ہے، بلکہ بوڑھے بابورام کو بطور تحفہ (یاد لہن کی قیمت کے طور پر) تین ہزار روپے نقد دینے کا وعدہ بھی کرتا ہے؛ اور یوں، ایک معصوم لڑکی کی زندگی اور اس کے مستقبل کا یہ شرمناک سودا چند سکوں کے عوض پکا ہو جاتا ہے۔“ (۸)

چند روز بعد، نرملہ جب اپنی بوڑھی پھوپھی سروجنی کے ہمراہ بازار سے گزر رہی ہوتی ہے، تو وہ معصومانہ اشتیاق کے تحت یہ خواہش ظاہر کرتی ہے کہ اسے کم از کم اس کے ہونے والے شریک حیات کی ایک جھلک ہی دکھا دی جائے۔ سروجنی پھوپھی جب اشارے سے اس سن رسیدہ جوہری (کشیپ دت) کی طرف متوجہ کرتی ہے، تو نرملہ اپنے مستقبل کی یہ بھیانک تصویر دیکھ کر مارے حیرت، صدمے اور غصے کے سروجنی کا ہاتھ جھٹکتی ہے اور وہاں سے دیوانہ وار بھاگ کھڑی ہوتی ہے۔ وہ اس ذہنی دباؤ اور سرا سیمگی کے عالم میں بھاگتے بھاگتے اچانک ایک مسجد کی سیڑھیوں کے پاس لڑکھڑا کر گرنے لگتی ہے، لیکن عین اسی لمحے دو مضبوط اور توانا ہاتھ آگے بڑھ کر اسے گرنے سے بچا لیتے اور سہارا دیتے ہیں۔ نرملہ جب اضطراب کے عالم میں نظر اٹھا کر دیکھتی ہے، تو اس کے سامنے ایک انتہائی وجیہہ، پُرکشش اور صحت مند نوجوان کھڑا ہوتا ہے۔ نرملہ اس نوجوان کے مثالی اور خوبصورت سراپے سے مسحور ہو کر نیم بے ہوشی کے عالم میں کہتی ہے: "کیا تم کرشن بھگوان ہو؟" وہ اجنبی اس معصومانہ تشبیہ پر قہقہہ لگا کر جواب دیتا ہے: "نہیں، میں شیر علی خان کا فرزند محمد خان ہوں اور اس شہر میں نیا وارد ہوا ہوں۔"

”نرملہ— جو بے جان بتوں کی پوجا سے تنگ آچکی تھی— نے صحن کے تمام بتوں کو اوندھے منہ ایک لائن میں کھڑا کیا اور ان کے آگے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر کہنے لگی: 'میں تمہاری غلام نہیں ہوں، مجھے تم سے گھن آتی ہے اور میں تمہاری فرماں برداری سے انکاری ہوں۔' (اس موقع پر محمد خان نے بابورام کو لاکارتے ہوئے کہا کہ) 'اس لڑکی کو الگ رکھا جائے گا، اور جب یہ سن شعور کو پہنچ کر ایک بالغ خاتون بن جائے گی، تبھی اس کی شادی کی جائے گی تاکہ اگلی نسل کمزور نہیں بلکہ توانا پیدا ہو۔ اگر تمہیں یہ شرط قبول نہیں، تو مجھ سے مقابلے کے لیے تیار ہو جاؤ! بابورام اس جرات مند اندہ گفتگو کو سن کر خوف کے مارے اس نوجوان کے پیروں میں گر پڑا اور بولا: 'لڑکی آپ کے حوالے ہے۔'“ (۹)

سوشیلا جب بیر سٹر شبیر کی زبانی یہ دل دوز داستان سنتی ہے، تو وہ شریعت اسلامیہ کے مصلحانہ اصولوں سے شدید متاثر ہوتی ہے اور شبیر سے بانی اسلام ﷺ کی ذات گرامی سے تفصیلی تعارف کرانے کی خواہش کرتی ہے۔ شبیر وقتی طور پر اس گفتگو کو ملتوی کر دیتا ہے، تاہم اگلے روز سوشیلا کے پیہم اصرار پر وہ اسے سرور کائنات ﷺ کے احوال زندگی اور دنیا میں دین اسلام کی اشاعت و تلوین کے تاریخی مراحل سے آگاہ کرتا ہے۔ وہ اسے بتاتا ہے کہ آپ

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ اعلانِ نبوت سے قبل ہی سماج میں 'امین' اور 'صادق' کے القاب سے پہچانے جاتے تھے اور شدید ترین معاشرتی مخالفت اور مصائب کے باوجود اپنے موقفِ حق پر جرات کے ساتھ ڈٹے رہے۔ ان آفاقی حقائق کو سن کر سوشیلا کا دل بتدریج اسلام کی اخلاقی کشش کی طرف راغب ہونے لگتا ہے، اور وہ دوسرے مذہب سے تعلق رکھنے کے باوجود شبیر کی فکری و شخصی جرات کے سحر میں مبتلا ہو کر اس سے محبت کرنے لگتی ہے۔ شبیر جب اس کے ان پوشیدہ جذبات سے واقف ہوتا ہے، تو وہ کمالِ دیانت داری سے اسے فہمائش کرتا ہے کہ فکری جذباتی پن اور جلد بازی مناسب نہیں؛ اسے چاہیے کہ وہ پہلے اپنے مروجہ ہندو مذہب کی بنیادی کتابوں کا بھی غیر جانبدارانہ مطالعہ کرے اور ان کے محاسن کا جائزہ لے۔ مگر سوشیلا کے شعور پر اب حق واضح ہو چکا تھا، اس لیے اسے روایتی مصلحتیں لاحقہ معلوم ہوتی ہیں اور اس کا ذہنی جھکاؤ روز بروز اسلام کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اسی فکری تسلسل میں ایک دن وہ شبیر سے اسلامی شریعت میں عورت کے تمدنی حقوق اور تصورِ حجاب (پردے) کی حقیقی فلاسفی کے بارے میں استفسار کرتی ہے۔ شبیر شرعی نصوص اور اسلامی قوانین کا حوالہ دیتے ہوئے اسے سمجھاتا ہے کہ دینِ فطرت میں صنفِ نازک کو کس قدر تعظیم اور بلند مرتبہ عطا کیا گیا ہے، اور ساتھ ہی واضح کرتا ہے کہ پردے کا اصل مقصد عورت کی عفت و تکریم کی حفاظت 'کرنا ہے، اس پر کوئی جبر یا قید مسلط کرنا نہیں۔

سوشیلا اگرچہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور روشن خیال دوشیزہ ہے، تاہم عقدِ نکاح جیسے اہم تمدنی فریضے میں وہ روایتی مذہبی تفریق کی رکاوٹوں کو ناپسند کرتی ہے۔ مگر آگے چل کر مختلف حالات، فکری حوادث اور انقلابی واقعات کی بنا پر وہ بتدریج دینِ اسلام کی حقانیت اور شبیر کی شخصیت کے قریب آتی چلی جاتی ہے۔

سوشیلا کے اہل خانہ کو جب اس کے ان بدلتے ہوئے مذہبی رجحانات کا علم ہوتا ہے، تو اس وقت تک بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے؛ کیونکہ وہ نہ صرف اسلام قبول کر کے دائرۂ اسلام میں داخل ہو چکی ہوتی ہے، بلکہ بیرسٹر شبیر کے ساتھ رشتہ ازدواج میں بھی منسلک ہو جاتی ہے۔ اس غیر متوقع فیصلے پر اس کے والدین شدید ردِ عمل کا اظہار کرتے ہوئے اسے اور شبیر کو اپنے گھر سے بے دخل کر دیتے ہیں۔ وہ اپنے تئیں کتنے ہی جدید اور روشن خیال کیوں نہ رہے ہوں، لیکن مروجہ خاندانی و مذہبی حدود کے دائرے سے باہر نکلنے کا حوصلہ ان میں بھی نہیں تھا، اور ان کے لیے اپنی بیٹی کا قبولِ اسلام ایک خاندانی سبکی اور باعثِ شرم امر تھا۔ اس سخت خاندانی مخالفت اور بایکٹ کے باوجود، سوشیلا

اپنے اس شعوری اور فکری فیصلے پر مکمل طور پر مطمئن تھی اور اس نے اپنے شریک حیات کے ساتھ ایک نئی پُرسرت اور باوقار خانگی زندگی کا آغاز کیا۔

”تقریباً پچاس برس قبل، نذر سجاد حیدر جس ہندوستانی تمدن اور ماحول میں زندگی بسر کر رہی تھیں، وہاں ان کا شمار ایک انتہائی روشن خیال اور ترقی پسند خاتون کے طور پر ہوتا تھا۔ وہ برصغیر کے مسلم معاشرے کی ان ابتدائی نقیب اور رہنما خواتین میں شامل تھیں، جنہوں نے معاشرتی جبر کا شکار بے شمار مظلوم عورتوں کے حقوق کے لیے جرات مندانہ آواز بلند کی، اور انہیں مرد اساس معاشرے کے ظلم و استحصال سے نجات دلانے کے لیے ایک مصلحانہ جدوجہد کا آغاز کیا۔“ (10)

مصنفہ اپنے اصلاحی نظریات اور فکری خیالات کو قارئین تک پہنچانے کے لیے ناول کے متحرک کرداروں کو بطور ذریعہ استعمال کرتی ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ اگر عقد نکاح سے قبل کوئی لڑکا یا لڑکی کسی کے ساتھ رشتہ محبت میں منسلک ہوں، لیکن ان کی مرضی کے خلاف ان کی شادی کسی دوسری جگہ کر دی جائے، تو دونوں فریقین کی خانگی زندگی شدید ذہنی عذاب کا شکار ہو جاتی ہے۔ روایتی طور پر صابر اور نیک طبیعت میاں بیوی تو اس ناانصافی پر سمجھوتا کر کے رو دھو کر عمر کاٹ لیتے ہیں؛ مگر بعض جرات مند اور حساس طبیعتیں ایسی ہوتی ہیں جو اپنے جذبات کے خلاف بزرگوں کے ایسے جابرانہ فیصلوں کو تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیتی ہیں، اور اپنے حقیقی چاہنے والوں کی فرقت ان کے لیے ناقابل برداشت ہو جاتی ہے۔ ایسے دباؤ کے ماحول میں ان نوجوانوں سے جو معاشرتی انحراف یا رد عمل سرزد ہوتا ہے، وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ چنانچہ، مصنفہ کا یہ حتمی موقف ہے کہ ازدواجی بندھن جیسے اہم ترین تمدنی فیصلے میں ہمیشہ لڑکے اور لڑکی کی آزادانہ مرضی اور دلی رضامندی کو اولیت حاصل ہونی چاہیے۔

ڈاکٹر سید جاوید اختر لکھتے ہیں:

”یہ سچ ہے کہ شادی میں لڑکے اور لڑکی کی مرضی شامل کرنا لازمی ہے، مگر کبھی ایسی مجبوریاں سامنے آ جاتی ہیں کہ اس کے برعکس فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔ ویسے آج کل عام طور پر لڑکیوں کی پسند کا پاس رکھا جاتا ہے۔ تاہم، نوجوانوں کو بھی چاہیے کہ وہ خاندانی حالات اور والدین کی مشکلات کو سمجھیں اور اپنے اندر ضبط پیدا



کریں۔ وہ اپنے جذبات پر قابو پانا سیکھیں اور والدین کے فیصلوں کے سامنے
ضد یاباغی نہ بنیں۔ یہ فکری پختگی اسی وقت ممکن ہے جب بچپن سے ان کی
اچھی پرورش کی گئی ہو، کیونکہ ایسے موقعوں پر دینی اور اخلاقی تربیت کا اثر بہت
مددگار ثابت ہوتا ہے اور انسان کے لیے اپنی پسند کو قربان کر کے صبر کر لینا
نہایت آسان ہو جاتا ہے۔“ (۱۱)

نذر سجاد حیدر کا ناول ”مذہب اور عشق“ تانیثی تناظر میں اردو فکشن کے اندر نسوانی بیداری اور فرسودہ
معاشرتی ملوکیت کے خلاف مزاحمت کی ایک کلیدی دستاویز ہے۔ تحقیقی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو یہ متن بیسویں
صدی کے ابتدائی عشروں میں مسلم دوشیزاؤں کی فکری خود مختاری، شخصی آزادی اور ان کے دلی جذبات و مروجہ
مذہبی حدود کے مابین جاری کشمکش کی حقیقی عکاسی کرتا ہے۔ نذر سجاد حیدر نے پدر شاہی (مرد اساس) نظام میں عورت کو
روایتی طور پر ایک مجبور، مظلوم اور مغلوب اکائی کے طور پر پیش کرنے کے بجائے، اسے اپنے مقدر کا فیصلہ کرنے والی
اور اپنے فکری زاویوں پر کاربند ایک جرات مند فرد کے روپ میں ابھارا ہے۔ ناول کا یہ تانیثی جوہر اس حقیقت کو
مبرہن کرتا ہے کہ مصنفہ نے مذہب اور عشق کے مروجہ مردانہ بیانیوں پر فکری سوالات اٹھائے ہیں، اور یہ واضح کیا
ہے کہ کس طرح عورت اپنی انفرادی شناخت اور وجود کے اثبات کے لیے ان دونوں مؤثر عناصر کے مابین اپنی راہ
خود متعین کرتی ہے۔

نذر سجاد حیدر نے عشق کو محض ایک سطحی یا رومانوی مہم جوئی کے بجائے عورت کی فکری آزادی اور حق
انتخاب کا وسیلہ بنایا ہے، جبکہ مذہب کو اس کے حقیقی، ترقی پسند اور انصاف پسندانہ روپ میں پیش کرتے ہوئے سماجی
جبر کے خلاف ایک ڈھال کے طور پر استعمال کیا ہے۔ مصنفہ کا تانیثی بیانیہ عورت کے حقوق، تعلیم اور اس کی داخلی
دنیا کی پیچیدگیوں کو بڑی بے باکی سے اجاگر کرتا ہے۔ نچوڑ کے طور پر، یہ ناول اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ نسوانی
آزادی اور تشخص کی جنگ کسی بیرونی تصادم کا نام نہیں، بلکہ یہ معاشرتی اقدار، مذہبی تشریحات اور ذاتی جذبات کے
مابین ایک متوازن اور باوقار سمجھ بوجھ پیدا کرنے کا نام ہے، جس میں عورت کسی کی تابع نہیں بلکہ اپنی قسمت کی خود
مختار تخلیق کار ہے۔

Research Journal

Tahqeed



تحقیق
مختصی بآراء

eISSN:2789-6331

pISSN:2789-4169

Published: 30-06-2026

Volume 07, Issue 01

جلد 07، شماره 01



حوالہ جات

- 1- عقیلہ جاوید، اردو ناول میں تانیثیت، ملتان: بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ۲۰۰۵ء، ص ۱۸
- 2- نذر سجاد حیدر، مذہب اور عشق، مرتبہ: قرۃ العین حیدر، دہلی: ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، ۲۰۰۴ء، ص ۸۵
- 3- ایضاً، ص 123
- 4- ایضاً، ص 114
- 5- ایضاً، ص 170
- 6- ایضاً، ص 92
- 7- ایضاً، ص 106
- 8- ایضاً، ص 112
- 9- ایضاً، ص 140
- 10- سید جاوید اختر، ڈاکٹر، اردو کی ناول نگار خواتین، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء، ص ۳۷
- 11- ایضاً، ص ۱۳۰-۱۳۱